ڈاکٹر تقی عابدی کا گھر

ایک عظیم الشان مکان کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی مسکراتے باہر آئے۔

''آپ کا انتظار بہت دیر سے تھا۔'' وہ بولے۔

''ہم علامہ اقبال کے معتقد ہیں۔ دیر سے آتے ہیں۔''

''ٹھیک کہا۔ اقبال دیر سے آتا ہے۔''

''آج کے اقبال کا دیر سے آنا، راستہ بھول جانا تھا۔''

''صبح کا بھولا صبح ہی گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔'' تقی عابدی نے کہا۔

بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ دو سیڑھیوں کے بعد سنگ مرمر کا فرش، سامنے اوپر جاتا زینہ، سیدھے ہاتھ پر ڈرائنگ روم، بائیں طرف کوریڈور۔

ہم کشادہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ تقی عابدی کی بیگم کیتی آ گئیں یہ ایرانی ہیں۔ اردو سمجھتی اور بولتی ہیں۔

انہوں نے فارسی میں کچھ کہا اور تقی عابدی بولے۔

''آیئے ناشتے پر گفتگو ہوگی۔''

''آپ نے ناشتہ نہیں کیا۔ اس وقت تو گیارہ بجے ہیں۔''

''آج چھٹی ہے۔ پھر آپ کا انتظار تھا۔''

بائیں طرف باورچی خانہ برابر ڈائننگ ٹیبل، ایک کرسی پر ہم اور دوسری پر تقی عابدی بیٹھ گئے۔ گیتی ایک ڈش لائیں، پلیٹیں، چمچے، بسم اللہ کیجئے۔'' وہ بولیں۔ ''ڈش کا ڈھکن اٹھایا۔ ''آپ کے لیے نہاری ہے۔''

''ارے آپ کو کیسے معلوم ہوا ہم نہاری شوق سے کھاتے ہیں۔''

''انسان کراچی، لاہور میں رہے اور اس ڈش سے رغبت نہ ہو یہ ممکن نہیں۔'' تقی عابدی نے کہا۔ پھر چمچے سے دو بوٹیاں پھر شوربا پلیٹ میں ڈالا۔ اس میں نہاری والی کوئی چیز نظر نہ آئی۔

''یہ بکرے کی زبانیں ہیں ایران کی خاص ڈش..... نیبو، ہرا دھنیہ، ہری مرچیں ڈال کر نوش کریں۔'' تقی عابدی نے سلیقے سے سجی ایک ڈش سامنے کر دی۔

''زبانیں.....؟'' ہم نے حیرانی سے اپنی پلیٹ کو دیکھا۔

''یہ ہم پہلی بار کھائیں گے۔''

''اور مایوس نہیں ہوں گے۔'' تقی عابدی نے جملہ پورا کیا۔

گیتی ایک ڈش میں بیگل لے آئیں یہ گول روٹی کی طرح ہوتے ہیں۔

''ایرانی روٹی۔'' عابدی بولے۔

''ہم اسے امریکی سمجھتے تھے۔ کئی دن سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں کیا خبر ایران پر امریکہ نے دھاوا بول دیا ہو۔ اور اب ان کی روٹی بھی ایرانی ہوگئی ہو۔

بیگل اور بکرے کی زبان دونوں کا اشتراک پہلی بار چکھا۔ نیبو، ہرا دھنیہ اور مرچوں نے لطف دیا۔ ''یہ لذیذ ہے۔ ہم ناشتے اور کھانے کے درمیان برنچ سمجھ کر کھا رہے ہیں۔''

یہ سننا تھا کہ تقی عابدی نے چمچے سے دو زبانیں اور ہماری پلیٹ میں رکھ دیں۔

''اتنی زبان نہ کھلائیں۔ اب ایسا نہ ہو ذرا دیر بعد ہم منمنانے لگیں۔''

گیتی یہ ڈش اکثر پکاتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم وہی زبان بول رہے ہوتے۔'' تقی عابدی ہنسنے لگے۔

''ہم نے سنا ہے۔ مغل بادشاہ شہزادیوں کو بلبل کی زبان کھلواتے تھے، ان کے لہجے میں شیرینی آجائے۔'' ہم نے کہا۔

''وہ بلبل اور شہزادیوں کا میل تھا۔ ہم ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ اس لیے اطمینان سے کھائیں جو زبان بولتے آئے ہیں وہی بولتے جائیں گے۔'' تقی عابدی نے ڈھارس بندھائی۔ زبان اچھی ہو تو پسند کی جاتی ہے۔ تقی عابدی نے اصرار کر کے اتنی کھلا دیں کہ ہماری زبان بند ہوگئی۔ پیٹ بھر گیا لیکن گیتی کا تکلف نہ گیا۔

''اور کھائیں..... اور لیں..... یہ لیجیے۔''

عابدی نے فارسی میں شاید سمجھایا۔ اس لیے وہ چائے لینے چلی گئیں۔

ہم عابدی کے ساتھ برابر کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ جہاں ٹیلی وژن پر کوئی پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ عابدی نے بند کیا۔ اسوقت پلیٹوں میں آم آ گئے۔

''یہ آپ کے لیے پاکستان کا چونسا۔'' وہ بولے۔

''پاکستان کا چونسا..... یہاں..... کیسے.....؟'' ہم حیران تھے۔

''جناب ٹورانٹو میں باقاعدہ ہفتے میں دو بار آتا ہے۔''

ہم نے ایک قاش اٹھا کر مکھی چکھی، واقعی یہ چونسا تھا۔

''آپ نے بڑا ظلم کیا۔ پہلے بتایا ہوتا، اس کے لیے بھی جگہ رکھتے۔ نہاری سے پہلے آم ہماری کمزوری ہے۔''

''اس میں ہم بھی شامل ہیں۔'' تقی بولے۔ ''شروع کیجیے صحت مند انسان ہیں۔''

''آپ ڈاکٹر ہیں۔ ایک کاغذ پر لکھ دیں تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔''

''آم کھانے سے انسان صحت مند رہتا ہے غالب کی مثال سامنے ہے۔ بے احتیاطی کے

باوجود 73 سال زندہ رہے۔ آم کھانے کی وجہ سے۔'' تقی نے کہا۔

''اتنی عمر کافی ہے۔'' ہم نے آم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

آم کی قاشیں کھلانے کے لیے تقی عابدی کو اصرار نہیں کرنا پڑا۔ جب تک چائے آئی پلیٹیں خالی ہو گئیں۔

''اور.....'' وہ بولے۔

''باندھ دیں..... ساتھ لے جائیں گے۔'' ہم نے کہا۔

''انہوں نے آواز دے کر گیتی سے فارسی میں کچھ کہا۔

ہم منع کرتے رہے لیکن وہ آم کی دو پلیٹیں لے آئیں۔ چائے کی مہک اچھی، اور ذائقہ پسندیدہ تھا۔ یہ نہاری اور آم پر بگھار تھی۔

ہم تقی عابدی کی لائبریری دیکھنے کے مشتاق تھے۔ جس کی ایک عالم میں دھوم ہے۔ اس لئے جلدی چائے ختم کی۔ ایک طرف سفید سیڑھی گھومتی نیچے جا رہی تھی۔ اس سے گھومتے آخری سرے پر قدم رکھا تو ایک ہال دکھائی دیا۔ سوڈیڑھ سو افراد کی محفل آسانی سے ہو سکتی تھی۔

دائیں طرف راستہ تھا۔ دونوں سمت، چار بیڈ روم جو ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ تھے۔ مہمان خانہ ہے۔ اہم اور ممتاز دانشور یہاں ٹھہرتے ہیں۔ آخری کمرہ تقی عابدی کے استعمال میں ہے یہاں انٹرنیٹ، فیکس، ٹیلی فون، ٹیلی وژن سب ہی کچھ ہے۔ دنیا سے منسلک رہتے ہیں۔ تقی عابدی کا زیادہ وقت یہاں صرف ہوتا ہے۔ مسودے کی جانچ، کتابوں کا مطالعہ اور تنقیدی مضامین کا لکھنا اس کمرے میں ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہ بڑا کمرہ جو اردو ادب کا بیش قیمت خزانہ ہے یہاں صدیاں سانس روکے کھڑی ہیں۔ وقت تھم گیا ہے۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے یعنی مخطوطات رکھے ہیں۔ یہ انمول ہیں، انہیں حاصل کرنے کے لیے تقی عابدی نے وقت کا سرمایہ اور اچھے ان گنت دن لگائے ہیں۔ اس لائبریری میں 1440 مخطوطات ہیں جس میں زیادہ تعداد مرثیوں کی ہے۔ جس میں فارسی اردو دونوں شامل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کاغذات کی تعداد 8 سے 9 لاکھ ہے۔

ہم ذرا دیر میں ماضی میں اترنے لگے۔ یہ لکھنو ہے۔ میر انیس کا زمانہ ہے، یہ دلی ہے میر کا دور ہے، یہ الہ آباد ہے، اکبر آبادی کا شہر ہے۔

تقی عابدی محبت سے نادر پرانی تحریریں دکھا رہے تھے۔ کاغذ کا رنگ اڑ گیا ہے۔ کہیں کتابت دھندلی پڑ گئی ہے۔ تاریخ پڑھی نہیں جاتی۔ نام مٹا ہوا ہے۔ لیکن مرثیے کے بند، غزل کے شعر موجود ہیں۔

یہ مخطوطات صاف شفاف پلاسٹک کی تھیلیوں میں محفوظ ہیں ان پر تاریخ اور وقت لکھا ہے۔ اس زمانے میں یہ رسم تھی جس سے آج فائدہ ہوا۔ دور کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب سے محبت کرنے والے بہت ہیں لیکن اس حد تک دیوانے کم ہوں گے۔ یہ تحریریں تقی عابدی کے دل کے ٹکڑے، جگر کے گوشے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ مرثیے لکھے، غزلیں تحریری کیں شاید وہ بھی اتنی چاہت نہ کر سکے ہوں۔ وہ کب واقف تھے کہ برسوں بعد ایک شخص بستی بستی، پربت پربت ان تحریروں کو تلاش کرے گا۔ شاید یہ رضا الٰہی ہے کہ اس کے پیاروں کے لیے لکھے الفاظ محفوظ رہیں اور تقی عابدی لائبریری میں جمع ہو جائیں۔ دنیا میں کسی شخص کی ذاتی لائبریری میں اتنی تعداد میں مخطوطات نہ ہوں گے۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ والوں کو ان کا نام ایک ریکارڈ کی صورت میں محفوظ کرنا چاہیے۔

ہمارے سامنے 1200ھ 226 سال پرانا مرثیہ تھا۔ یہ ایک ملکہ جہان کی ملکیت ہے۔ شاعر نے مرثیہ لکھا اور ملکہ کے نام کر دیا۔ ملکہ کو زمین کی چادر ملی لیکن مرثیے پر لکھا نام صاحبان مرثیے کے طفیل زندہ رہ گیا۔ 225 سال پرانا مرثیہ میر خلیق کا تحریر کردہ ہے جب کہ زینب نے سناصبح لڑائی ہوگی۔ میر انیس کے والد محترم تھے۔ اللہ نے ان کے خاندان کو مرثیہ لکھنے کا فن عطا کیا تھا۔

نول کشور نے لکھنو سے 1880 میں میر تقی میر کا دیوان شائع کیا۔ اس کا ایک جلد پروفیسر آغا حیدر حسن کے پاس تھی۔ وہ مطالعہ کرتے پسندیدہ اشعار پر سرخ نشان لگاتے۔ وہ ہمارے سامنے تھا۔ اور موسموں نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

مرزا انیس کے بھائی اس کے شاگرد فضل رسول فضل تھے۔ان کے مرثیے دیکھے۔

بھگتی کی شاعرہ روپ کماری مسلمان ہوگئی۔اس نے جو مرثیے لکھے وہ ہمارے سامنے تھے۔ وقت نے اسے بھی لافانی کر دیا۔تقی عابدی کے لائبریری میں آرام سے ہے۔یہ اس کا دیوان شاع کر رہے ہیں۔اس کا انتساب سید محمد حمید رضوی کے نام کیا ہے۔یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ 2004ء میں خالق دنیا ہال کراچی پاکستان میں مرثیہ پر گفتگو کی ایک محفل تھی۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری صدارت کر رہے تھے۔ڈاکٹر تقی عابدی نے تقریر کی۔تقریب کے اختتام پر ایک صاحب ان کے پاس آئے۔

''میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔کہاں ٹھہرے ہیں؟''

تقی عابدی نے ہوٹل کا نام بتا دیا۔وہ صاحب چلے گئے۔

شام کو عابدی کو واپس آنا تھا۔یہ تیار ہو کر نیچے اترے تو وہ صاحب ہاتھ میں بستہ لیے کھڑے تھے۔''یہ آپ کے لیے۔''وہ بولے۔

انہوں نے کھول کر دیکھا۔اس میں 38 نادر مرثیوں کے مخطوط تھے۔تقی عابدی کو خزانہ مل گیا۔ خوشی سے دل دھڑکنے لگا۔ان صاحب کو الگ لے جا کر پوچھا۔

''کیا نذرانہ پیش کروں؟''

'یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔آپ سے بہتر کون اس کا حق دار ہوگا۔''یہ سید محمد حمید رضوی تھے۔ڈاکٹر تقی عابدی کیا کرتے.....بس آنکھوں میں شکرانے کے سمندر لے آئے۔کتابوں کی الماریوں کے درمیان شاعر،ادیب،نقاد اطمینان سے آرام کر رہے تھے۔

''ان کاغذات کو موسموں کے احتساب اور وقت کی دیمک سے کیسے محفوظ کریں گے؟''ہم نے پوچھا۔

''کوڈک کمپنی ایک مشین ایجاد کر رہی ہے۔جس کے محلول میں کاغذ ڈبویا جائے تو اس پر مخصوص پلاسٹک کی تہہ چڑھ جائے گی یوں سمجھیں پلاسٹک کوٹنگ ہوگی۔پھر وقت اس پر اثر انداز نہیں ہوگا۔''

''یہ کب تک آجائے گی؟''

''دو سال میں۔ میں نے آرڈر دے دیا ہے۔ اس کی قیمت 3 ہزار ڈالر ہوگی۔''

تقی عابدی دنیا کے ممتاز پیتھالوجسٹ میں شمار ہوتے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ کاغذوں کی حفاظت بھی جانتے ہیں۔

دیوار پر علامہ اقبال کی ایک قلمی تصویر لگی تھی ایک واقعہ اس کا بھی ہے۔ اسے قیوم حیدرآبادی نے 1941ء میں بنایا تھا اقبال اکیڈیمی حیدرآباد دکن نے اس کی نمائش کی تھی۔ اس کا ذکر ڈاکٹر صفدر قادری کی کتاب میں ہے۔ جو حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ دوسری کتابوں میں بھی اس کی تفصیل ہے۔ تصویر کی عمر 64 سال ہوگی۔ ہم نے دیدار کیا۔

اردو کی پہلی صاحب دیوان خاتون شاعرہ ماہ لقا چندا دیوی ہیں۔ یہ غالب سے چند سال پہلے شاعری کرتی تھیں۔ حیدرآباد کی نامی گرامی طوائف تھیں۔ ان کی قبر حیدرآباد دکن کے مولا علی ٹاؤن میں موجود ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

تم منہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو

لگ چلنا ایسے ویسے سے دستور مت کرو

چندا دیوی کا دیوان سو سال پہلے شائع ہوا۔ اس کی ایک کاپی تقی عابدی کے پاس دیکھ کر حیرت ہوئی۔

اس شاعرہ نے اپنے نام ماہ لقا اور چندا بائی دونوں سے فائدہ اٹھایا۔ اشعار میں اس کا استعمال کر کے مصرعوں کا حسن بڑھایا۔ اس لائبریری کے مخطوطات دیکھنا بڑے اعزاز کی بات ہے۔

تقی عابدی علامہ اقبال کے مدح ہیں۔ ان دنوں شکوہ جواب شکوہ کی اشاعت کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ہمیں کتابت کا نمونہ دکھایا۔ لاہور کے ایک نامی گرامی کاتب نے اسے لکھا ہے۔ ہر صفحے پر ایک بند، انہوں نے نہیں بتایا لیکن ہمیں معلوم ہوا۔ کاتب نے سب کے ایک ہزار روپے لیے۔ یہ کل 65 بند ہیں۔ اتنی رقم علامہ اقبال کو مل جاتی تو وہ کم از کم شکوہ نہیں لکھتے۔

مخطوطات جمع کرنے میں کبھی انہیں سخت کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑا۔ تقی عابدی کو خبر ملی لکھنو کے علاقے فیض آباد کے ایک گاؤں میں ایک صاحب کے پاس نادر مخطوط ہیں۔

یہ بغیر دیر کیے اس سمت روانہ ہو گئے۔ فصل کٹ چکی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ کھیتوں سے کچی پگڈنڈی سے گزرتے بے حال ہو گئے۔ پیاس اور گرمی کی شدت کا اندازہ اس دن ہوا۔

گاؤں آ گیا..... ایک شکستہ گلی میں پہنچے۔ اس کے کونے پر ایک پرانا مکان تھا۔ وقت اس پر سے بڑی بے دردی سے گزرا تھا۔ یہی منزل مراد تھی۔ مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بزرگ نے باہر جھانکا پھر دروازہ بند کر لیا۔

تقی عابدی مکان کے برابر پتھر پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگے۔ منزل پر پہنچ کر نا کام نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ذرا دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ اس بار نہ صرف دروازہ کھلا بلکہ آواز آئی ''اندر تشریف لائیے۔''

یہ کامیابی کی آواز تھی۔ تقی عابدی تیزی سے اندر پہنچے ہلکا اندھیرا اور ٹھنڈک کا احساس، سامنے ایک بزرگ کھڑے تھے۔ انہوں نے تخت کی طرف اشارہ کیا۔

''تشریف رکھیے۔'' یہ بیٹھ گئے۔

''فرمائیے؟''

''سنا ہے آپ کے پاس کچھ مرثیوں کے مخطوط ہیں۔'' تقی عابدی نے کہا۔

''جی..... فرمائیے..... پھر.....؟'' بزرگ نے پوچھا۔

''میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں، بہت دور سے آیا ہوں۔'' عابدی بولے۔

سنجیدہ بالوں والے بزرگ نے ایک لمحے کو سوچا پھر اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے ایک میلے کچیلے کپڑے کا بستہ لائے۔ سامان بیٹھ کر احتیاط سے کھولا۔ تقی عابدی نے دیکھا۔ گدڑی میں لعل۔ ہمت کر کے کہا۔

''میں ایک لائبریری بنا رہا ہوں۔ میرے پاس سینکڑوں مخطوط ہیں۔ کیا آپ مجھے یہ دے سکتے ہیں؟''

بزرگ نے فوراً بستہ بند کرلیا۔

''میرے پاس یہ زیادہ محفوظ رہیں گے۔آپ جو کہیں وہ نذرانہ پیش کروں؟'' تقی عابدی نے ہمت نہیں ہاری۔

بزرگ خاموش رہے۔

''میں ان کاغذات کی حفاظت کا بہت اچھا انتظام کیا۔ [illegible]

''کیا پیش کریں گے؟'' بزرگ بولے۔

''جو آپ فرمائیں۔'' تقی عابدی کو کامیابی نظر آنے لگی۔

''بزرگ سوچتے رہے پھر بولے۔''تیرہ ہزار روپے۔''

تقی عابدی کے لیے یہ قیمتی ہیرے کوڑیوں کے مول تھے۔

''جی...... میں پیش کرتا ہوں۔'' جیب سے روپے نکال کر بزرگ کو دیئے۔انہوں نے پہلے کپڑے کا بستہ تقی عابدی کے حوالے کیا۔

چہرے سے لگتا تھا اپنے جگر کا گوشہ حوالے کر رہے ہیں۔

''یقین کریں اس کی بہت دیکھ بھال کروں گا۔''

بزرگ آزردہ تھے۔

''ایک گلاس پانی مل جائے گا۔'' عابدی بولے۔

بزرگ مردہ قدموں سے اٹھ کر گئے۔مٹی کے کوزے میں پانی لے آئے اور روپے لوٹاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تیرہ ہزار مانگے تھے۔آپ نے غلطی سے 26 ہزار دے دیئے یہ زائد رقم واپس ہے۔''

''قبلہ میں نے 26 ہزار ہی دیئے ہیں۔کاش میں 26 ارب دے سکتا۔آپ نے انمول خزانہ دیا ہے۔اس کا کوئی مول نہیں۔براہ کرم حقیر نذرانہ قبول کر لیجئے۔'' تقی عابدی نے نرم لہجے میں کہا۔

سفید بالوں والے بزرگ سامنے کھڑے تھے اور تقی عابدی نے دیکھا ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بس کناروں سے چھلکا چاہتے تھے۔ پھر وہ منہ پھیر کر اندر چلے گئے۔

تقی عابدی گاؤں سے واپس آ رہے تھے تو گرمی تھی نہ پیاس نہ تھکن۔ موسم جانے کب خوشگوار ہو گیا تھا۔ کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ پات ہرے تھے۔ پھول کھلے تھے۔ رم جھم بادو باراں تھی۔ اور تقی عابدی تیز تیز قدموں سے فیض آباد کی طرف آ رہے تھے۔ جیسے اودھ فتح کر کے آ رہے ہوں۔

☆.....☆.....☆